اردو ادب میں تانیثیت

ڈاکٹر کوثر رسول

تلخیص: عصرِ حاضر میں تانیثیت اور اس سے وابستہ ابعاد اہم ادبی ڈسکورس کا حصہ بن چکے ہیں، اور آج تانیثیت نئی ادبی وتنقیدی تھیوری کی شکل میں کبھی مارکسی تانیثیت، کبھی انتہا پسند تانیثیت، کبھی نفسیاتی تانیثیت، تو کبھی مابعد جدید تانیثیت میں نیو مارکیسیت اور ایکو تانیثیت کی صورت میں ادبی، لسانی اور ثقافتی تاریخ کو مرتب کرنے میں پیش پیش ہے۔

کلیدی الفاظ: تانیثیت، مارکسیت، مرد اساس، تشخص، معاشرتی نظام، بغاوت، ردِ تشکیل، نفسیاتی مسائل

آج تانیثیت کی اصطلاح ہمارے اردو شعر وادب کیلئے بھی کوئی نیا یا اجنبی رجحان نہیں رہا ہے اور نہ شجرِ ممنوعہ جس کے قریب جانا گویا پدری سماجی نظام سے بغاوت تصور کیا جائے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ ہمارے ہاں ابھی بھی تانیثیت سے وابستہ تصورات جن میں نسائیت، نسائی حسیت یا نسائی اظہار سے متعلق تمام ڈسکورس میں معنی ومفہوم کے اعتبار سے کچھ ایسی یکسانیت پائی جاتی ہے، جو بسا اوقات مخمصے کی ایک الجھا دینے والی کیفیت کو جنم دیتی ہے۔ جہاں مصنف یا قاری بھی عجیب تذبذب کا شکار رہتا ہے۔

تانیثیت اور نسائیت دو الگ اصطلاحات ہیں۔ نسائیت رجحان سے زیادہ ایک جبلت ہے جو کسی بھی عورت کے ہاں پیدائش کے وقت سے ہی موجود رہتی ہے جبکہ تانیثیت ایک ایسا فکری رجحان ہے جس کا شعور عورت کے اندر وقت کے سرد وگرم واقعات سے نبرد

آزمائی کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے۔اس اعتبار سے یہ ایک اکتسابی چیز ہے۔دراصل بات اتنی سی ہے کہ خواتین کی فکر اور ان کے شعور سے متعلق مباحث کسی اور دنیا کی باتیں لگتی ہیں۔ عورت مفکر، فلسفی اور دانشور بھی ہو جائے اور علم و ادب کے اجارہ داروں سے کہے کہ آپ نے جو فکر پیش کی ہے یا ہماری تحریر سے جو معنی اخذ کئے ہیں وہ تو سرے سے اس میں موجود ہی نہیں۔اگر چہ ایسا کہنا ادب اور فلسفے میں کوئی نئی بات نہیں ہے، مگر اس کا حق صرف مرد مصنف کو حاصل ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اردو شعر و ادب اور تنقید پر صرف مردوں کا غلبہ رہا ہے اور عورت ہر جگہ غائب ہے اور اگر کہیں ہے بھی تو مرد کے نقطۂ نظر سے ایک خاموش بت کی صورت میں موجود ہے۔ جیسا کہ German Gayer نے اپنی کتاب The Female Eunuch, 1970 میں کہا تھا......

> ''صنفی افتراق جو مرد اور عورت کے درمیان ہے اس کو بدلا نہیں جا سکتا، البتہ معاشرے کے پروردہ تصورات کو بدلنے کی ضرورت ہے۔''[1]

معاشرے کے انہیں تصورات کو بدلنے اور تشخص کی تلاش سے نمٹنے کیلئے یہ ضروری ہو جاتا تھا کہ عورت ان تمام اداروں جہاں ابھی تک مردوں کا لوہا مانا جاتا تھا اور سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کرے، اور اس طرح عورت کی شخصیت بہ حیثیت عورت دنیا کے سامنے پیش کرنے کی سعی کرے۔ چنانچہ پس ساختیات کے تحت خواتین نے بالکل ایسا ہی کیا۔اس اعتبار سے پس ساختیات جس کو Study of Absence بھی کہا جاتا ہے کا تانیثیت کے ساتھ ایک قریبی تعلق بن جاتا ہے۔پس ساختیاتی فکر و فلسفہ نے حاشئے پر چلی گئی چیزوں کو مرکزیت دے کر ان کو اپنا آپ منوانے کا موقعہ فراہم کیا۔اس فکری نظام نے تانیثی تحریک کیلئے سمت کا تعین بھی کیا اور اس کو تقویت بھی دی۔

تانیثیت کی تحریک نہ صرف خواتین کی جنسی و حیاتیاتی محکومیت کے خلاف احتجاج کا نام ہے بلکہ یہ سماجی اور قانون ساز حلقوں سے مرد کے مساوی حقوق کی دعویدار بھی ہے اور سب سے زیادہ یہ اس تذکیری تصور کی نفی کرتی ہے جس کی رو سے عورت ناقص العقل بھی

ہے اور مجبور و محض بھی۔ تانیثیت کی تحریک کے اولین نقوش میری وول سٹون کرافٹ کی کتاب A Vindication of the Rights of Women میں ملتے ہیں۔ جس میں انہوں نے مرد اساس معاشرتی نظام کی تنقید کے ساتھ ساتھ خواتین کی اہمیت کو بھی جتایا تھا۔ اسی طرح جان اسٹوراٹ کی مل نے On the Subjugation of Women لکھ کر لوگوں کی توجہ سماج کی اس نابرابری اور غیر معتدل روّیے کی طرف مبذول کرانی چاہی۔ مگر جس کتاب نے پورے عالم کے مرد اساس ادبی و سیاسی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا وہ فرانس کی ایک اہم نظریہ ساز خاتون Simon de Beavuiour کی کتاب Le Bouxine Sexe, 1949 ہے، جس کا ترجمہ بعد میں انگریزی میں 1974 میں The Second Sex کے نام سے کیا گیا۔ سیمون نے نہ صرف تانیثی رجحان کو بڑھاوا دیا بلکہ یہ دعویٰ بھی کیا کہ:

''عورت کی آزادی درحقیقت مرد کی آزادی ہے''۔ ۲

دوسری طرف امریکہ کی Betty Freudian کی کتاب 1963 میں "The Feminine Mystique" سامنے آئی جس کو آزادئ نسواں کی تحریک Women's Liberation Movement کے نئے دور کا نیا منشور کہا جاتا ہے۔ اس ضمن میں امریکہ کی Dorothy Par کی "Modern Women: The Last Sex"، فرائیڈن کی Kate Millet، "Beyond Gender" کی "Sexual Politics"، جرمن گیئر Gayer کی "The Female Eunuch, 1974" اور "Sex and Destiny" اور اِن میں سب سے اہم Virginia Woolf کی "A Room of One's Own, 1928" ہے۔ ورجینیا وولف کی کتاب سیمون اور فرائیڈن سے بھی پہلے کی کتاب ہے۔ جس کا آغاز ہی انہوں نے اپنے مشہور مضمون اور لیکچر Women & Fiction سے کیا تھا۔ سیاسی محاذ سے قطعی نظر میں اپنی گفتگو کا موضوع شعر و ادب میں خواتین کی آمد اور تانیثی رجحان کی ترویج پر مختص کرتی ہوں۔ یعنی میرا موضوع ''اردو ادب میں تانیثیت'' ہے۔ اگرچہ یہ موضوع بہت وسیع ہے اور گلوبل ہونے کے ناطے اس کے حیط

حوالہ میں بہت سارے سماجی، سیاسی افکار و شعبہ جات آتے ہیں، تاہم میں فقط تین جہات کو اپنی بحث کا موضوع بنانا چاہوں گی۔ اوّل فکشن، دوم شاعری اور تیسری جہت تنقید ہے۔ جب ہم عالمی ادبیات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں فکشن کے حوالے سے تین قسم کا ادب ملتا ہے۔ اول وہ ادب جو خواتین پر تخلیق کیا گیا مگر خالق مرد تھا، دوم وہ ادب جس کو خلق کرنے والی اگرچہ خواتین ہی تھیں مگر ان پر مردوں کی سوچ اور عورت سے متعلق ان کے تصورات غالب تھے، اور تیسرا وہ ادب جو خواتین نے اپنے نسائی شعور کے ساتھ تانیثیت کی حمایت میں تخلیق کیا ہے۔

تانیثیت کی تحریک کے آغاز میں انگریزی کی سنجیدہ کتب کے ساتھ ساتھ جس صنف کو زیادہ دخل رہا ہے وہ فکشن کی اہم صنف ناول ہے۔ جیسا کہ Neil Armstrong نے کہا تھا:

> ''ناول نہ صرف خواتین کے تہذیبی اقتدار کا ذریعہ ہے درحقیقت ناول کا ظہور خواتین کے اختیار کا ایک حصہ اور وسیلہ بنا''۔[۳]

انگریزی ناول کے ذریعہ خواتین نے سماج میں اپنی حیثیت میں بدلاؤ کی جدوجہد کا آغاز انتہائی سبک انداز میں کیا۔ اس ضمن میں آسٹن، برونٹی ہمشیرگان، گیسکل اور ورجینیا وولف کے نام اہم ہیں۔ اسی طرح اردو میں ناول کا آغاز بھی عورتوں کی تعلیم اور ان کے اخلاقی تربیت کی غرض سے ڈپٹی نذیر احمد کے ہاتھوں ''مراۃ العروس 1869'' سے ہوا ہے۔ ان کے بعد خواتین باقاعدہ طور پر اس طرف متوجہ ہوئیں۔ اردو کی پہلی خاتون ناول نگار رشیدۃ النساء ُاصلاحُ النساء، 1888ء لے کر جب سامنے آئیں تو انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ:

> ''خدا نذیر صاحب کو عافیت میں بڑا انعام دے۔ جہاں تک وہ جانتے تھے لکھا اور اب جو ہم جانتی ہیں لکھیں گی''۔[۴]

انہوں نے ایک طرف جہاں نذیر احمد کے اقدام کو سراہا دوسری طرف اشارتاً یہ بھی کہنا چاہا کہ خواتین گھر اور گھریلو زندگی سے متعلق واقعات کو زیادہ مؤثر انداز میں پیش

کر سکتی ہیں۔جیسا کہ ورجینیا وولف نے بھی کہا تھا کہ خواتین کا مشاہدہ زیادہ وسیع ہوتا ہے بلکہ انہوں نے یہاں تک کہا تھا کہ خواتین کی تربیت ہی فکشن نگار کی حیثیت سے ہوتی ہے۔ ایک طرف اردو ناول میں انگریزی کے Samuel Richards اور Charles Dickens کی طرح ہادی رسوا اور راشد الخیری فکشن کی پہلی قسم کو خلق کرتے ہوئے خواتین کی حمایت میں ناول لکھ رہے تھے تو دوسری طرف فکشن کی تیسری قسم بھی اپنا آپ منوانے کی تگ دو میں مصروف تھی۔ان میں عصمت چغتائی، خدیجہ مستور، قرۃ العین حیدر پیش پیش تھیں۔افسانوی ادب میں اگرچہ مردوں میں پریم چند نے ''بڑے گھر کی بیٹی'' راجندر سنگھ بیدی نے ''لاجونتی''، ''اپنے دکھ مجھے دیدو'' کی صورت میں عورتوں کے کرداروں اور انکی نفسیات کو اپنے افسانوں میں جگہ دی مگر پریم چند اپنے افسانے (بڑے گھر کی بیٹی) میں شروع سے آخر تک ایک ہی گردان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔بڑے گھر کی بیٹی کے یہ سنسکار ہونے چاہیے۔اس افسانے کی مرکزی کردار اپنے دیور کی بدتمیزیوں کو صبر و تحمل سے برداشت بھی کرتی ہے اور گھر کو ٹوٹنے سے بھی بچاتی ہے، مگر ایک عورت ہونے کے ناطے اپنی عزت نفس کو بچا نہیں پاتی لیکن اس کے باوجود سنسکاری ہے اور پریم چند فخر سے کہتے ہیں کہ ''بڑے گھر کی بیٹی ایسی ہی ہوتی ہے''۔گویا کہ سنسکار صرف عورت کیلئے ضروری ہے۔

البتہ راجندر سنگھ بیدی اس بات سے واقف ہیں کہ عورت کی نفسیات مرد سے مختلف ہے، اس لئے وہ جب لاجونتی میں ایک defamiliar جملہ لکھتے ہیں ''لاجونتی ایسی عورت تھی جو گاجر پر لڑ پڑتی تھی اور مولی سے مان جاتی تھی'' تو بے ساختہ انکے تجزیے پر ستائشی کیفیت دل میں پیدا ہوتی ہے۔اتنا ہی نہیں وہ اس افسانے کے توسط یہ بھی باور کراتے ہیں کہ 'عورت' دیوی کے بجائے محض عورت ہی رہنا چاہتی ہے اور وہ مرد کے ساتھ اپنے فطری ازدواجی رشتے میں خوش ہے۔مگر ''اپنے دکھ مجھے دیدو'' کی اندو جس کی تمام قربانیاں اس کے شوہر کے سامنے ہیچ ہیں۔جب راجندر سنگھ بیدی اندو سے مصالحت کروا کر اسکی ایک آخری قربانی یعنی عزتِ نفس کو بھی بھینٹ چڑھواتے ہیں تو قاری کو اس بات پر یقین کرنا ہی پڑتا ہے کہ مرد چاہ کر بھی عورت کی نفسیات اور احساسات کی ہو بہو عکاسی نہیں کر سکتا۔جولیا

کرسٹیوا نے کہا تھا کہ ''ہم پر آج تک بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر ہمارے لئے کبھی کسی نے کچھ نہیں لکھا''۔

چنانچہ یہ کام منٹو نے کر دکھایا۔منٹو نے کہا تھا۔

''تم لوگ عورت عورت کہتے ہو،عورت ہے کہاں؟''

سچ مانئے تو عورت صرف منٹو کے ہاں ہی موجود ہے اپنے ہر روپ میں۔منٹو کے افسانوں کی عورت مرد تصور کے برخلاف معمولی شکل وصورت، بے ڈول جسم، بد بودار ملگجے لباس میں اپنی جسمانی و روحانی احتیاج کی تسکین کیلئے سرگردان عمل ہے۔اس کو libidal خواہشات کے ساتھ ساتھ عزت نفس اور ego کے تحفظ کا بھی خیال ہے۔ یہ سوگندھی کی صورت میں اپنی ہتک کو id میں ہیجانی کیفیت میں تبدیل کر کے پدری سماج کے خلاف شدید ردِ عمل کا اظہار کرتی ہے اور ایک خارش زدہ کتے کو گلے لگا کر mysoginy میں پناہ لیتی ہے۔مگر منٹو کے بعد پھر کسی مرد ادیب نے عورت کو اپنے فکشن میں اس طرح رواں دواں نہیں دکھایا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کام خواتین نے خود انجام دیا،جن میں پہلا نام ڈاکٹر رشید جہاں کا آتا ہے۔انہوں نے اپنی ہم صنف خواتین کی روایتی image جو مرد اساس تصور سے متشکل تھی اس کی ردِ تشکیل کر کے عورت کے وجود کو اثبات بخشنے کی پہلی کوشش کی اور ساتھ ہی انفسانوی ادب میں ecriture feminine عورتوں کے گھریلو بول چال کے بھر پور تخلیقی اظہار کی گنجائش پیدا کی۔اس ایک چراغ سے بعد میں کئی اور چراغوں کو روشنی ملی جن میں سرفہرست نام عصمت چغتائی کا آتا ہے۔عصمت چغتائی زندگی بھر اس کوشش میں مصروف رہیں کہ ہندوستانی سماج میں عورت کے منصب کو اونچا کیا جائے۔ عورت کی زندگی کے ہر پہلو کو انہوں نے جو اپنی ابتدائی زندگی میں دیکھے تھے،ان کا تاثر ان کے ذہن پر مدتوں قائم رہا۔اور اس شدید قسم کے تاثر جو حقیقتاً انتہا پسند radical تانیثی روّیے کے طور پر سامنے آتا ہے، نے ان سے کئی خوبصورت افسانوں جن میں " گیندا"، " چوتھی کا جوڑا"، " ننھی کی نانی"، "لحاف"، "بہو بیٹیاں" کی تخلیق کروائی۔اگر چہ یہ افسانے متنازعہ فیہ رہے اور ان کو کافی تنقید کا سامنا رہا مگر انہوں نے نہ خود ہمت ہاری اور نہ اپنی تبلیغ

ہی چھوڑی۔ وہ دیگر خواتین کی ڈھارس یوں بندھاتی رہیں:

''لکھئے...... ضرور لکھئے...... جو کچھ آپ دیکھتے ہیں، سنتے ہیں، سوچتے ہیں، وہ ضرور لکھئے۔ نہ زبان کی غلطیوں سے ڈریئے نہ اس بات سے کہ کوئی آپ کو ادیب نہیں مانتا''۔۵؎

ان کے بعد قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، جیلانی بانو، بانو قدسیہ، واجدہ تبسم وغیرہ اپنے افسانوی ادب میں خواتین کی سماجی زندگی میں پدرانہ نظام کے طفیل جبرو استحصال کی متعدد کہانیاں بُنتیں رہیں۔ اسی طرح خطۂ جموں وکشمیر سے تعلق رکھنے والے فکشن نگار کیوں کر اس دوڑ میں شامل نہ رہتے۔ شروع کے افسانہ و ناول نگاروں سے قطعۂ نظر 1980 کے بعد آنے والے فکشن نگاروں جن میں مرد اور خواتین دونوں شامل تھے نے اس طرف توجہ کی جن میں حامدی کاشمیری، شفق سوپوری، دیپک کنول اور دیپک بدکی، وحشی سعید اور 2000ء کے بعد خواتین میں نکہت نذر ترنم ریاض، نیلوفر ناز نحوی، رافعیہ ولی وغیرہ ایسی خواتین (گو کہ فہرست نامکمل ہے) ہیں جو کسی نہ کسی انداز میں تانیثیت سے متعلق مسائل کی نمائندگی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہیں۔

جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے تو انگریزی ادب کی طرح خواتین اس طرف ذرا بعد میں آئیں ہیں، وجہ...... شاعری کی زبان قدرے تذکیری ہوتی ہے، عروض سے واقفیت ناگزیر ہے اور سب سے اہم یہ ادب کا ایسا شعبہ ہے جس پر مردوں کی اجارہ داری مستقل و مسلسل رہی ہے۔ اگر چہ انگریزی کی طرح یہاں بھی اکا دکا خواتین ملتی ہیں مگر اول تو ان کے لہجے تذکیری ہی رہے۔ دوم شروع میں انہوں نے خود کو اس میدان میں misfit ہی پایا کیونکہ یہاں نہ کوئی ڈپٹی نذیر احمد تھا نہ علامہ راشد الخیری، نہ کوئی بیدی تھا اور نہ ہی منٹو جو ان کی نفسیاتی الجھنوں اور روحانی درد و کرب کو صفحۂ قرطاس پر اتارتے۔ رہی سہی کسر ''ریختی'' نے پوری کی تھی جو ان کی image پہلے سے ہی مسخ کر دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کی اولین شاعرات جیسے سعادت بانو کچلو، زاہدہ خاتون شیروانیہ، خدیجہ بیگم، منجھو بیگم، رابعہ پنہاں، مسز ڈی برکت رائے نے شروع میں حب الوطنی کے موضوعات پر شاعری کی اور

روایتی موضوعات پر اگر کچھ کہا بھی تو بھی اپنے لہجوں کو قصداً تذکیری ہی رکھا۔ مگر 1960 کے بعد ہندو پاک میں ایسی شاعرات سامنے آئیں جنہوں نے اپنی نسائی حسیت کا بھرپور اظہار کیا۔ ان میں ادا جعفری، فہمیدہ ریاض، سارہ شگفتہ، پروین شاکر، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدہ وغیرہ پیش پیش رہیں۔ انہوں نے anxiety of influence کے سہارے کے بغیر ہی مردوں کے طے شدہ معیارات سے انحراف کر کے اپنے impulses کو اہمیت دے کر ان کے اظہار کو ایک نئی قوت و توانائی کے ساتھ ممکن بنایا۔ یہ خود کو دریافت کرنے لگیں، ایسے میں ان کے لہجوں میں شکایت بھی در آئی مگر یہ شکایت نرم گرم دونوں روّیے رکھتی تھی۔ جیسا کہ پروین شاکر اپنی ایک غزل میں کہتی ہیں ۔

ردا کے ساتھ لٹیرے کو زادِ راہ بھی دیا
تیری فراخ دلی میرے دیر ایسی تھی
بس اک نگاہ مجھے دیکھتا چلا جاتا
اس آدمی کی محبت فقیر ایسی تھی

اسی طرح سارہ شگفتہ اپنی ایک نظم ''اینٹی کلاک وائز'' میں مرد کی عورت کے تین عصبیت و منافرت کو ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں ۔

میرے ہونٹ تمہاری مجازیت کے گن گا گا کر
تھک بھی جائیں
تب بھی تمہیں یہ خوف نہیں چھوڑے گا کہ
میں بول تو نہیں سکتی
لیکن چل تو سکتی ہوں
میرے پاؤں میں زوجیت اور شرم وحیا کی بیڑیاں ڈال کر
مجھے مفلوج کر کے بھی
تمہیں یہ خوف نہیں چھوڑے گا
کہ میں چل تو نہیں سکتی
مگر سوچ تو سکتی ہوں

آزاد رہنے، زندہ رہنے اور میرے سوچنے کا خوف
تمہیں کن کن بلاؤں میں گرفتار کرے گا!

ان سے بھی زیادہ جارحیت کشور ناہید کے ہاں ملتی ہے جس میں طنزیہ چبھن بھی شامل ہے۔

گھاس تو مجھ جیسی ہے
گھاس بھی مجھ جیسی ہے
پاؤں تلے بچھ کر ہی زندگی کی مراد پاتی ہے
مگر یہ بھیگ کر کس بات کی گواہ بنتی ہے
شرمساری کی آنچ کی
کہ جذبے کی حدت کی
گھاس بھی مجھ جیسی ہے
ذرا سر اٹھانے کے قابل ہو
تو کاٹنے والی مشین
اسے مخمل کرتی رہتی ہے
عورت کو بھی ہموار کرنے کے لئے
تم کیسے کیسے جتن کرتے ہو
نہ زمیں کی نمو کی خواہش مرتی ہے
نہ عورت کی
میری مانو تو وہی پگڈنڈی بنانے کا خیال درست تھا
جو حوصلوں کی شکستوں کی آنچ نہ سہہ سکیں
وہ پیوندِ زمیں ہو کر
یوں ہی زور آوروں کے لئے راستہ بناتے ہیں
مگر وہ پرکار ہیں
گھاس نہیں

گھاس تو مجھ جیسی ہے!

موجودہ منظرنامے میں تانیثیت کے حوالے سے شائستہ حبیب، تنویر انجم، شاہدہ حسن، سمینہ راجا، یاسمین حمید، منصورہ احمد، عارفہ شہزاد، نصرت مہدی اور ہمارے جموں و کشمیر سے سیدہ نسرین نقاش، رخسانہ جبین، شفیقہ پروین، نکہت نذر، شبنم عشائی، ترنم ریاض، ربینہ میر، شبینہ آرا، مصروفہ قادر، پروین راجہ (فہرست نامکمل ہے) اس دوڑ میں شامل ہیں۔ ان سبھی کے یہاں تانیثیت سے متعلق کئی موضوعات جس میں نسائی حسیت اور عورت کو درپیش سماجی ونفسیاتی مسائل سبھی کچھ موجود ہے۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ ان سبھی نے اپنی ایک الگ انفرادیت قائم کی ہے کوئی غزل کی صنف میں مشاق ہیں تو کوئی نظم کی لڑیوں میں اپنے نغمے پرونے میں مصروف ہیں تو کوئی نثری نظموں میں ملائم ولطیف احساسات کو سلیقہ مندی سے اس طرح پیش کرتی ہیں کہ اس عمومیت پر بھی ادبیت غالب آجاتی ہے۔ رخسانہ جبین صاحبہ کی غزل سے دو اشعار ؎

حق جیسا ہو اسے جتانے والے تم
فرض کوئی ہو اسے نبھانے والے تم
میری انا کو انا نہ کہنے والے تم
آئینہ یہ تمہیں دکھانے والی میں

نسرین نقاش کے یہاں ہلکی جارحیت بھی ملتی ہے۔

صلیب

کاٹ دو ہاتھ، سر قلم کر دو، میرے چہرے سے نوچ لو آنکھیں
کھینچ دو کھینچ سکے جو میری زبان، میری سانسوں میں ڈال دو زنجیر
ہاں مگر!
اس سے قبل میں تم سے
صرف اتنا سوال پوچھوں گی
اپنے احساس کی صلیب سے تم
کیا فراموش کر سکو گے مجھے؟

شبنم عشائی کے ہاں جارہیت یانسیت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

محبت کا آخری لقمہ، اسی دسترخوان پہ لیا تھا ہم نے
جو تمہارے انتظار میں
بچھا ہوا ہے اب بھی......
ان کے فرش پہ، محبت کا دل ٹوٹ کے گر پڑا
قاب نوحے سے بھر گئی، روٹھ کر جانے والے، دسترخواں کو رونق
بخشنے سے......تم رہ گئے
اور میں......محبت کرنے سے!

غرض ان کی شاعری پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ وہ نئے زمانے کی عورت کو سامنے لا رہی ہیں۔ وہ عورت کو ایک انسان، معاشرے کا باخبر فرد جانتے ہوئے اس کے تشخص اور اس کی نفسی انفرادیت پر ایمان رکھتی ہیں۔ اسے زندگی کے دھارے میں شامل دیکھتی ہیں۔ اگر چہ سبھی کے یہاں تانیثیت کی تفہیم ورویے میں فرق یا اختلاف پایا جاتا ہے مگر اس اختلاف کو بقول Specks کے delicate divergency کا نام دیا جاسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لمحۂ موجود تک آتے آتے عورت نے اپنے تمام تجربات، اپنے مسائل، اپنی روحانی تنہائیوں اور جذبات کی شکست وریخت سے متعلق سارے سچ بول دیئے ہیں اور شعر و ادب میں پوری ہمت وحوصلہ کے ساتھ ساتھ تخلیقی قرینے سے بیان کرنے کی ایک تاریخ بھی مرتب کر لی ہے۔

جہاں تک تنقید کا تعلق ہے تو تانیثیت کے رجحان نے شعر وادب کی تخلیق کے بعد یہ ضرورت محسوس کی کہ اس ادب کو پرکھنے اور اس کی تفہیم کے بھی الگ پیمانے اور دائرے کار ہونے چاہیے۔ اس طرح ساٹھ کی دہائی میں امریکہ کی ایک اہم ادیبہ اور تانیثیت کی فکر کی حامی خاتون Elaine Showalter نے Gynocriticism کی اصطلاح متعارف کرائی یعنی تنقید کا ایسا شعبہ جہاں خواتین کے لکھے ہوئے شعر وادب کو پرکھنے اور اس پر فیصلہ صادر کرنے والی ناقدہ یعنی عورت ناقد ہی ہو۔ تانیثی تنقید نے خواتین کے ادب کی تفہیم کے ساتھ ساتھ ان تمام مطالبات کو بھی رد کیا جن کی بنیاد ادب میں متعصّبانہ جنسی

تخصیص کے معروضے پر قائم ہے۔ تانیثی تنقید کے حدود اور طریق کار parameters کو درج ذیل نکات کی روشنی میں دیکھا جاسکتا ہے۔

۱/ عورت ایک تخلیق کار بھی ہے اور قاری و نقاد بھی۔ اس اعتبار سے اس کی شخصیت اس کے معاصر مرد تخلیق کار اور نقاد سے یقیناً مختلف ہوسکتی ہے۔

۲/ ایک تخلیق کار کی حیثیت سے کیا وہ مروجہ ادبی روایتوں کی اسیر رہی ہے یا وہ ان سے انحراف کرتی ہے۔ ایک نقاد کی حیثیت سے بھی وہ کس حد تک روایت سے الگ یا اس سے منسلک ہے۔

۳/ ایک مرد تخلیق کار نے عورت کو کس طرح پیش کیا ہے۔ کیا اس نے عورت کو مرد کے روایتی زاویہ نگاہ سے پیش کیا ہے یا پھر اس میں کسی طرح کی تبدیلی کو قبول کیا ہے، یا پھر عورت کے تئیں ہمدردی ظاہر کرنے کی غرض سے پدری نقطۂ نگاہ کو پیش کیا ہے۔

۴/ مرد قاری کے تعصّبات اور عورت قاری کے تعصّبات کیا ہیں؟ تانیثی تنقید یا تھیوری خصوصی طور پر اس ادبی کاوش یا تخلیق کے بین المتون میں چھپے اس discourse کو سامنے لاتی ہے جو ایک طبقہ کی نفسیاتی گجیوں اور conflicts کا اثبات کرتے ہوئے انہیں منظر عام پر لاکر ایک نئے discourse کی دعوت دیتی ہے۔

درحقیقت تانیثی تنقید New Freudian اور پس ساختیات کے نظریات کی مزید توسیع کا نام بھی ہے۔ پس ساختیات نے ساختیات پر سوالیہ نشان لگاتے ہوئے صدیوں سے حاشئے پر چلی گئی چیزوں کو اہمیت دی۔ اسی طرح فرائیڈ نے جہاں تحلیلِ نفسی کے نظریے کو بنیاد بنا کر صرف مرد کے لاشعور میں اسکی ''انا'' اور اس کی جنسی سرگرمیوں کو اہمیت دی تھی وہیں نئی فرائیڈین تعویل نے عورت کے لاشعور کو بھی اہمیت دی۔ جس کی اہم مثال ایلن شووالٹر کی "A Literature of Their Own" ہے، جس میں انہوں نے انگریزی کی ادیباؤں کی تحریروں کا جائزہ psychoanalytic بنیادوں پر abnormal psychology کے تحت کرنے کی کوشش کی تھی۔ تانیثی تنقید ایسی تھیوری ہے جو خواتین کے داخلی و باطنی (لاشعور سے متعلق جذبات وخیالات، یا ہیجانات) جو کہ پدرانہ سماج کی

دین ہے کی ترجمانی کا م کرتی ہے۔ یہ اس self discourse کا نام ہے جس کو پڑھنے، سمجھنے یا پرکھنے کے پیمانے مرد ناقدین سے بالکل مختلف و متضاد ہیں۔

تانیثی تنقید میں Ecriture Feminine ایک واضح تصور کی طرح شامل ہے۔ جس کو متعارف کرانے والی فرانسیسی مفکر ہیلن کیکزوس تھیں۔ جن کا کہنا ہے کہ عورتوں کا ادب اپنے نظامِ الفاظ، زبان، لہجے، جذبات و احساسات کے اعتبار سے مردوں کی زبان سے مختلف و متضاد نشانات کا حامل ہوتا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ماسوائے چند جگہوں کے خواتین کی کوئی ایسی تخلیق نہیں ہے جہاں وہ تانیثی نقوش نہ چھوڑے۔ Ecriture Feminine خواتین کی تخلیقات کی اہمیت کو استوار کرنے کی کوشش کرتی ہے اور تانیثی تنقید کے اصول و ضوابط کو بھی واضح کرتی ہے۔ gynocriticism میں آج خواتین کے ادب کو چار طریقوں سے زیر مطالعہ لایا جاتا ہے۔ حیاتیاتی biological، لسانیاتی linguistical، تحلیل نفسی psychoanalytical اور تہذیبی بنیادوں cultural perspective سے پرکھنے کی کوشش۔

اردو میں اگر چہ تانیثی تنقید نے بس دو دہائیوں سے ہی پاؤں پاؤں چلنا شروع کیا ہے۔ اگر چہ ممتاز شیرین اپنے زمانے کی منجی ہوئی ناقدہ ہیں مگر ان کے ہاں کی تنقید مروجہ معیار پر ہی مبنی ہے۔ البتہ انہوں نے اپنی تنقیدی کتاب ''معیار میں جہاں مضمون'' منٹو نوری نہ ناری لکھا ہے، وہاں تانیثی تنقید کے نقوش ملتے ہیں جہاں وہ ترکیب گناہ میں ''عورت'' کا نام لیتے ہیں وہاں ممتاز شیرین نے ملائم انداز میں منٹو کے ہی نسائی کرداروں سے عورت کو اس الزام سے بری کیا ہے۔ اسی طرح سیدہ جعفر اپنی کتاب ''تنقید اور انداز نظر'' میں قرۃ العین حیدر کا ''جہان تخلیق'' کے عنوان سے جب بات کرتی ہیں تو تانیثی تنقید اور نسائی حسیت پر دو پیراگراف ضرور تحریر کرتی ہیں۔ یہی حال ساجدہ زیدہ اور زاہدہ زیدی کا بھی ہے، جنہوں نے ورجینیا وولف کے بقول شعوری طور پر خود کو نسائی لب و لہجہ یا طرزِ ادا سے روکا ہے کہ کہیں ان کی تنقیدوں کو بھی مغرب کی طرح قابل لا اعتنا نہ سمجھا جائے۔ تاہم جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ پچھلے دس بیس برسوں سے کئی خواتین ناقدائیں سامنے آئی ہیں جو بلا خوف و ڈر کے خواتین کی نگارشات پر قلم چلا رہی ہیں، ان میں شہناز نبی...... ''تانیثی

تنقید''، ترنم ریاض ''اردو کی خواتین افسانہ نگار''، جموں و کشمیر سے ڈاکٹر نصرت آرا چودھری، زنفر کھوکر، پروفیسر شفیقہ پروین صاحبہ، ڈاکٹر نکہت نذر، ڈاکٹر نصرت جبین صاحبہ وغیرہ بھی ہیں جو نہ صرف خواتین قلم کاروں بلکہ مرد اشخاص (شعراء و ادبا) کی نگارشات کی تفہیم و تجزیہ اور تنقید میں پیش پیش ہیں۔ اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بقول قرۃ العین حیدر...... ''تنقید اب مردوں کی مافیہانہ رہی''۔

❍❍❍

حواشی

۱: Feminist Critique of Language by Deborah Cameron

۲: The Second Sex 1974, Simon de Beavuiour

۳: Feminist Critique of Language by Deborah Cameron

۴: بحوالہ: دیباچہ...... ''اصلاح النساء'' از رشدۃ النساء۔

۵: بحوالہ رسالہ: ''شمع''، انٹرویو: عصمت چغتائی سے ایک ملاقات۔

❑❑❑